قرآن کریم کے خطاب میں استعارات۔۔۔اسرار و حکم اور ادبی محاسن

The Metaphors in the Addressal of the Holy Quran: Secrets and Literary Attributes

رافعۃ الجبین*
ڈاکٹر زاہدہ شبنم*

Quran addresses its readers in oratorical style which also varies with different social, economic and political subjects with which Quran deals. One of the linguistic features of Quran is the use of simile and metaphor which adds to the literary and rhetorical beauty of Quran. The use of metaphor increases the effective strength of any speech or prose. In a metaphorical style just a word or few words portray the whole imagery in the mind of the reader or listener. At the same time the reader/ listener also becomes aware of all the contextual details of that speech or writing. For this reason, metaphors are frequently used in literature in general and in Arabic literature in particular. The use of metaphors by Quran has a unique significance. A detailed study of Quranic metaphors opens new horizons of meanings in front of the reader and benefits the reader in many ways. This rhetorical aspect of the Quran has also been beautifully explained by the *Mufassireen.* The metaphors related to the religious, social and moral aspects of life used in Quran are the specific feature of the word of God.

کسی بھی کلام کی حقیقی شان اس کی تاثیر اور دل نشینی میں مضمر ہے، تاثیر و دل نشینی تب تک ممکن نہیں جب تک کہ کلام میں رعنائی خیال اور حسنِ بیان دونوں موجود نہ ہوں۔ موثر الفاظ، تخیلاتی رفعت اور معنوی وسعت و گہرائی دل پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ بلند اور اچھوتے خیال پر مشتمل مضمون اگر دلکش اسلوب اور موثر پیرایہ میں نہ پیش کیا جائے، تو لطیف اثرات اور لذت و کیفیت سے خالی رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عام سے اور فرسودہ مضامین بھی حسن اسلوب اور جدت ادا سے دل آویز ہو جاتے ہیں۔ قوت معانی، خوبیِ الفاظ، قوتِ دلائل اور عقل سلیم کا اظہار ہی خطابی اسلوب کا تقاضا ہوتا ہے۔ خطیب سامعین کے حوصلہ کو بلند کرنے اور انہیں جوش دلانے کے لیے خوب صورت اور واضح اسلوب کے ساتھ تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ خطیب کا مقام و مرتبہ، قوت گویائی، طاقت استدلال، آواز کا زیر و بم، حسنِ ادا اور مضبوط اشارات خطابی اثرات کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔ اس اسلوب کے واضح ترین امتیاز میں سے تکرار، مفردات کا عمدہ اور بر محل استعمال، ضرب الامثال، پر کشش اور دلوں پر اثر انداز ہونے والے کلمات کا انتخاب ہے۔

---

* ریسرچ سکالر، شعبہ علومِ اسلامیہ، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور۔
* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور۔

قرآن کریم اللہ رب العزت کا انسانیت کے نام ایک پیغام ہے جن کا انداز خطابی ہے جو اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو براہِ راست مخاطب کرتا ہے۔قرآنی خطاب میں خطاب کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، عقائد، عبادات اور معاشرتی، معاشی، سیاسی معاملات کی تفہیم کے لیے اپنا مخصوص اسلوب اس انداز میں اختیار کرتا ہے کہ اس میں علمی، ادبی اور خطابی اسالیب کی تمام خوبیاں یکجا نظر آتی ہیں، جہاں علمی حقائق کی وضاحت کرتا ہے تو نہایت واضح اور صریح الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔طرز استدلال انتہائی سادہ اور فطری ہوتا ہے اگر اس ضمن میں تشبیہ و تمثیل بھی پیش کی جاتی ہے، تو وہ بھی سادہ اور عام فہم انداز میں۔

اسی طرح خیالات کی لطافت و عمدگی کو اور تصور کی حقیقت کو پیش کرنے کے لیے ایسا فصیح و بلیغ ادبی اسلوب اختیار کرتا ہے جو علم بیان[۱] اور بدیع[۲] کی تمام خوبیوں سے مالا مال ہے۔ادائے بیان یعنی تشبیہ، تمثیل، مجاز مرسل، استعارہ، کنایہ اور تلمیح وغیرہ کو مختلف مسائل کی تفہیم کے لیے اس عمدگی سے لاتا ہے کہ مخاطب کے سامنے عقائد، احکام و معاملات اور تربیتی نصائح کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، نیز لفظی و معنوی حسن قرآن مجید کی بلاغت کی خوبیوں کو اور بڑھا دیتا ہے۔

ذیل میں مختصراً جائزہ لیتے ہیں کہ قرآن کریم کے خطاب میں استعارہ کا استعمال کس خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

استعارہ کا مفہوم:

لغت میں استعارہ کا مفہوم یہ ہے: اَعَارَہُ الشیء اِعَارَۃً ، وَعَارَۃً کسی سے کوئی چیز مانگنا۔[۳] اَلْمُعَاوَرَۃُ کہا گیا کہ اس کے معنی مستعار لینے کے ہیں۔اسی سے عَارِیَّۃٌ فَعْلِیَّۃٌ کے وزن پر ہے۔اسی سے کہا جاتا ہے تَعَاوَرَہ العواری استعمال کی چیزیں باہم لینا اور دینا۔[۴]

تَعَوُّرَ: کوئی چیز مانگنا، استعار الشئ منہ: عاریۃ کسی سے کوئی چیز مانگنا۔[۵] علم بیان کی رو سے استعارہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ کی جگہ علاقہ تشبیہ کی وجہ سے استعمال کرنا جس کے اس استعمال پر کوئی قرینہ بھی دال ہو جیسے لفظ اسد کا استعمال شجاع (بہادر) کے لیے۔[۶] استعارہ وہ مجاز لغوی ہے جس میں موضوع لہ و غیر موضع لہ کے درمیان مشابہت کا تعلق پایا جائے۔استعارہ کی بنا چونکہ مشابہت پر ہے اس لیے استعارہ دراصل تشبیہ کی ہی ایک صورت ہے البتہ تشبیہ کی معروف صورتوں میں اور اس میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ کی صورتوں میں کم از کم مشبہ اور مشبہ بہ کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔اور استعارہ میں اداۃ

شبہ اور وجہ شبہ [۷] کے حذف کے ساتھ مشبہ بہ میں سے کوئی ایک ضرور حذف ہوتا ہے۔[۸] علامہ جرجانی استعارہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ان استعارة فی الجملة ان یکون لفظ الاصل فی الوضع اللغوی معروفاً تدل الشواهد علی انه اختص به حین وضع، ثم یستعمله الشاعر أوغیر الشاعر فی غیر ذلک الأصل، وینقله الیه نقلاً غیر لازم، فیکون هناک کالعاریه [۹]

جملہ میں استعارہ یہ ہے کہ لغوی وضع کے اعتبار سے لفظ کی اسل معروف ہو۔اور شواہد دلالت کرتے ہوں کہ یہ لفظ جب وضع کیا گیا تو اس کے معنی کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ پھر شاعر یا غیر شاعر اسے اس اصل کے علاوہ استعمال کریں اور اسے غیر ضروری طور پر اس معنی (غیر اصلی) کی طرف منتقل کر دیں۔اب وہ لفظ وہاں پر عاریتاً ہو گا۔

علی بن محمد بن جرجانی استعارہ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الاستعاره : ادعاء معنی الحقیقة فی الشی ء للمبالغة فی التشبیه ، مع طرح ذکر المشبه من البَیّن ، کقولک: لقیت اسدًا ، وانت تَعْنِیْ به الرجلُ الشجاعُ۔[۱۰]

استعارہ دراصل کسی چیز میں حقیقی معنی پائے جانے کا دعویٰ ہے اور یہ تشبیہ میں مبالغہ ہے ایسے میں بیان سے مشبّہ کو غائب کر دیا جاتا ہے، آپ کہتے ہیں۔ ''لقیتُ اسدًا'' میں اسد سے ملا اور آپ اس سے بہادر آدمی مراد لیتے ہیں۔

علی جرجانی نے اسے استعارہ تصریحیہ کہا ہے۔[۱۱] کلام عرب میں بھی ایک کلمہ کی جگہ دوسرے کلمہ کو استعارۃ کہا جاتا ہے، جیسا کہ ابن قتیبہ لکھتے ہیں:

فالعرب تَسْعِیْرُ الْکَلِمَةَ فَتَضَعُها مَکَان الکَلمَة ، فیقولون للمطر : سماءٌ ؛ لانه من السماء ینزل [۱۲]

عرب ایک کلمہ کو مستعار لے کر اسے دوسرے کلمہ کی جگہ رکھتے ہیں مثلاً بارش کے لیے سماءٌ (آسمان) کا لفظ کہتے ہیں کیونکہ وہ آسمان سے اترتی ہے۔

جیسا کہ شاعر نے بھی بارش کے لئے آسمان کا گرنا کے لفظ استعمال کئے ہیں۔:

اِذا سَقَطَ السَّمَائُ بِأَرْض قومٍ رَعَیْنَاهُ وَاِنْ کَانُوْا غِضَابًا [۱۳]

جب آسمان (بارش) کسی قوم کی زمین پر برستا ہے تو ہم اس کی نگہداشت کرتے ہیں خواہ وہ غضبناک ہی کیوں نہ ہوں۔

لہٰذا استعارہ کی حقیقت یہ ہے کہ کلمہ کسی معروف بہا سے ایک ایسی شے کی جانب عاریتاً لے لیا جائے۔ جو کہ معروف بہا نہیں ہے اور اس بات کی حکمت یہ ہے کہ خفی کا اظہار اور ایسے ظاہر کا مزید وضوح ہے جو کہ ظاہر نہیں ہوتا ایسا مبالغہ کی غرض سے کیا جاتا ہے۔[۱۴] لہٰذا استعارہ کسی بات کی فہم اور اس کے ابلاغ میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس لیے فصاحت و بلاغت میں استعارہ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔[۱۵]

قرآن کریم جو فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ جس کی مثل لانے سے جن و انس عاجز ہیں۔ معنی و مقصود کی خوبصورت ادائیگی اور مفہوم کی توضیح کے لیے استعارات لاتا ہے اور اس کا استعمال اس عمدہ بلاغت سے کرتا ہے کہ عقائد، عبادات اور معاملات مخاطب کے سامنے اس طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ جیسے ان کے سامنے کوئی منظر ہو۔ استعارہ لانے کی حکمت بھی یہی ہے کہ مخاطب بات سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے۔ چنانچہ قرآن کریم کے خطاب میں استعارات کا استعمال بہت عمدگی سے اور جابجا کیا گیا ہے۔ ذیل میں قرآنی خطاب میں استعارات کے استعمال کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

{وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ}[۱۶]

اور بلاشبہ وہ (قرآن) اصل کتاب (لوح محفوظ) میں۔

{وَاِنَّهٗ} یعنی "القرآن" {فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ} "لوح محفوظ میں ہے۔"[۱۷] ام الکتاب وہ لوح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: {بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ، فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ}[۱۸] (یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔ لوح محفوظ میں (لکھا ہوا)۔ اسے نام دیا گیا "ام الکتاب" کے ساتھ۔ زمخشری کے نزدیک: (سمی بام الکتاب الانہ الاصل الذی اثبت الکتاب)[۱۹] قتادہ کے نزدیک: (اُم الکتاب اصل الکتاب وام کل شئی اصلہ)[۲۰] "ام الکتاب" سے اصل الکتاب مراد لی جاتی ہے اور ہر چیز کی "اصل" اس کی "اُم" ہوتی ہے۔ "لغت میں "ام الشی ء" معنی (اصلہ) اس کی اصل اور "ام" بمعنی والدۃ کے ہیں۔[۲۱] ہر اس چیز کو اُمٌّ کہا جاتا ہے، جو کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح و تربیت کا سبب ہو یا اس کے آغاز کا مبداء بنے۔[۲۲] خلیل فراہیدی کا قول ہے: (انَّ کل شیءٍ یَضُّم اِلَیْہِ سائر ما یلیہ فان العرب تسمی ذلک الشی اُمًّا)[۲۳] "ہر وہ چیز جس کے ساتھ قریب والی چیزیں مربوط ہوتی ہیں، عرب اسے "اُمّ" کا نام دیتے ہیں۔" اس کی حقیقت "وانہُ فی اصل الکتاب" تھی چنانچہ اصل کے لیے "ام" کا لفظ مستعار لے لیا گیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اصل سے فرع کی نشو و نما ہوتی ہے اسی طرح

ماں اولاد کے نشو ونما پانے کی جگہ ہے مطلب واضح کرنے کے لیے ایک پوشیدہ چیز کو ظاہر سے مشابہت دے دی ہے اور اس لیے کہ جو چیز دیکھائی دینے والی نہیں اس کی ایسی مثال پیش کی جائے کہ وہ دیکھائی دینے والی ہو جائے۔ اور اس طرح سننے والا سماع کی حد سے منتقل ہو کر آنکھوں سے دیکھنے کی حد تک پہنچ جائے اور بات کا مطلب مکمل واضح ہو جائے یہ بات بیان میں حد درجہ بلیغ ہے۔[۲۴]

چنانچہ استعارتاً ایسا بلیغ لفظ لایا گیا ہے جس نے لوح محفوظ کی حقیقت بالکل واضح کر دی یعنی اس کے مضامین اور اصول دین چونکہ ایک ہی جیسے ہیں اور پہلی آسمانی کتابوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے یہ سب کچھ پہلے سے ہی ہمارے پاس اصل کتاب میں لکھا ہوا موجود ہے۔ جسے ہم مختلف ادوار میں، مختلف انبیاء پر اپنی ہی زبانوں میں نازل کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہم نے قرآن لوح محفوظ سے عربی زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔[۲۵]

اسی طرح جو چیز واضح نہیں ہے اس کی ایسی مثال پیش کی جائے کہ وہ واضح ہو جائے جیسا کہ والدین کے ساتھ انتہائی شفقت کے ساتھ پیش آنے کے لیے استعاراتی اسلوب اختیار کیا گیا تاکہ محبت و شفقت کو مجسم کر کے پیش کر دیا جائے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ}[۲۶] "اور توجھکائے رکھ ان دونوں کے لیے بازو عاجزی کا۔" آیت میں "ذُلٌّ" کے لیے "جَنَاحٌ" بطور استعارہ ذکر کیا گیا ہے۔[۲۷] یہ استعارہ مکنیہ ہے "ذل" کو پرندے کے ساتھ تشبیہ دی ہے[۲۸] جو پر والا ہے پھر پرندے کو حذف کر دیا اور اشارہ کر دیا اس کے لوازم میں سے ایک چیز کا اور وہ ہے (الجناح) یعنی "پر"، پس یہ استعارہ ہے ان دونوں کے ساتھ شفقت و رحمت کرنے میں اور ان دونوں کے لیے جھکنے میں۔[۲۹] یہ اس لیے آیا ہے کہ نرمی کی تصویر قابل دید ہو۔[۳۰] لغت میں "الذل" کے معنی نرمی اور ضعف کے ہیں یعنی ان کے سامنے نرم بن کر رہا کرو۔[۳۱] اور "الجناح" کے معنی پرندے کے پر یا بازو کے ہیں۔[۳۲] یہاں "ذل" کے لیے پروں کا ذکر فرمایا اور پھر ان کو مبالغ کے لیے جھکانے کا حکم فرمایا۔ جناح کی ذل کی طرف اضافت بیان اور مبالغے کے لیے ہے یعنی والدین کے سامنے انتہائی تواضع وانکساری پیش آؤ۔ جیسا کہ امام بیضاوی رکھتے ہیں: (واضافته الی الذل للبیان والمبالغة........والمعنی واخفض لهما جناحک الذلیل)[۳۳]

"جناح" کے استعارے میں یہ تلمیح مضمر ہے کہ تمہارے والدین نے تمہارے بچپن میں تمھیں اس طرح اپنے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھا جس طرح پرندے اپنے بچوں کو پروں کے نیچے

چھپائے رکھتا ہے۔اس کا حق یہ ہے کہ ان کے بڑھاپے میں تم بھی انھیں اپنی اطاعت و محبت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو۔(۳۴)

یہاں استعارے کی حکمت یہ ہے کہ ناقابل دید چیز کو نمایاں اور پیش نظر کر دیا جائے تاکہ بیان میں حسن پیدا ہو اور چونکہ اس مقام پر مراد یہ تھی کہ بیٹا اپنے والدین کے سامنے عاجزی اور خاکساری کرنے میں کوئی ممکن پہلو فروتنی کا باقی نہ چھوڑے اس واسطے ضرورت ہوئی کہ استعارہ میں ایسا لفظ لیا جائے جو کہ پہلے لفظ سے زیادہ بلیغ ہو چنانچہ اس غرض سے ''جناح'' کا لفظ لیا گیا کیونکہ اس میں اس طرح کے معنی پائے جاتے ہیں جو پہلو جھکانے سے حاصل نہیں ہوتے۔ مثلاً پہلو کا جھکانا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنا بازو تھوڑا سا نیچا کر دے اور یہاں مراد یہ ہے کہ اس قدر جھکے کہ پہلو زمین سے مل جائے گویا بالکل فرش ہو جائے اور یہ بات بجز اس کے کہ چڑیوں کی طرح بازو (پروں) کا ذکر کیا جائے اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔(۳۵) کیونکہ پرندہ جب اڑنے کا اور بلند ہونے کا ارادہ کرتا ہے اپنے پر پھیلا لیتا ہے اور جب اڑنے کا اور بلند ہونے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے تو اپنے پر چھکا لیتا ہے۔اسی لیے تواضع اور انکساری میں مبالغہ کے لیے جناح کا لفظ لایا گیا ہے۔(۳۶)

{خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۭ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ}(۳۷)

مہر لگا دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر
پردہ ہے اور ان کے لیے عذاب ہے بہت بڑا۔

کفار کے دلوں میں ایمان کے نہ داخل ہونے اور ان کے ایمان نہ لانے کی کیفیت کا اظہار استعارتاً اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ کفار کا ایمان نہ لانا آنکھوں کے سامنے واضح شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ کہ جسے کفار کے دل برتن کی طرح ہوں اور کفار کے دل حق کو سمجھنے سے اسی طرح باز آگئے ہیں۔ جس طرح برتن کا منہ مہر لگا کر بند کر دیا جاتا ہے اس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ایمان نہ لانے کا اظہار بڑی عمدگی سے استعارتاً (ختم) کا لفظ لا کر بیان کیا ہے کہ جس طرح برتن پر مہر لگا کر بند کر دیا جاتا ہے ان کے دل بھی مہر لگا کر اسی طرح بند کر دیئے گئے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

استعارة تصريحيه شبه قلوبهم لتابيها عن الحق بالوعاءِ المختوم عليه، استعارة لفظ الختم بطريق الاستعارة التصريحيه للتصريح بلفظ المشبه به وحذف المشبه واداة التشبيه ووجه الشبه(۳۸)

یہ استعارہ تصریحیہ ہے کیونکہ انکار حق کی وجہ سے ان کے دلوں کو سربمہر برتن
سے تشبیہ دی ہے۔ لفظ ختم کو مستعار لے کر مشبّہ بہ کی صراحت کر دی جبکہ مشبہ،
حرف تشبیہ اور وجہ تشبیہ کو حذف کر دیا گیا۔

علامہ آلوسی نے بھی اسے استعارہ تصریحیہ لکھا ہے۔[۳۹] علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں: (بین سبحانہ فی هذه الایة المانع لهم من الایمان بقوله: {خَتَمَ اللّٰهُ})[۴۰] "اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کے لیے ایمان لانے کی راہ میں رکاوٹ کا ذکر کیا بقولہ ختم اللہ۔" اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے ایمان نہ لانے کو ختم اللہ کے قول سے بیان فرمایا ہے ختم کے لغت میں معنیٰ: مکمل کرنا، فارغ ہونا، آخر تک پہنچانا، چھپانا، برتن کے منہ کو موم یا مٹی وغیرہ سے بند کرنا حتیٰ کہ اس میں کوئی چیز باہر نکل سکے نہ داخل ہو سکے اور مہر لگانا ہے۔[۴۱] کسی چیز کی حفاظت میں آخری فعل مہر لگانا ہوتا ہے اسی لیے اسے ختم سے تعبیر کرتے ہیں۔[۴۲] {خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ} کا مفہوم واحدی نے یہ لکھا ہے: (واستوثق منها حتی لا یدخلها الایمان)[۴۳]

امام قرطبیؒ کے نزدیک کبھی "ختم" (مہر لگا دینا) حسی ہوتا ہے اور کبھی معنوی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں آیا پس دلوں پر مہر لگانے سے مراد اللہ سبحانہ کے پیغام حق کو یاد نہ کرنا، اس کے مخاطبات کا مفہوم محفوظ نہ کرنا اور اس کی آیات میں غور و فکر نہ کرنا۔[۴۴] آیات و معجزات کو دیکھنے کے بعد کفار کے دل میں ایمان و یقین کی روشنی کو پیدا نہ فرمانے، اسے قبول نہ کرنے کو مجازاً ختم، طبع، اغفال، اقساء اور غشاوہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے یا ان کے قلوب و حواس کو ایسی اشیا سے مشابہ قرار دیا گیا ہے جن پر پردہ پڑا ہوا ہے یا یہاں ختم سے مراد وہ دلوں کی سیاہی ہے جو گناہوں اور معصیتوں کے کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دلوں میں پیدا فرما دیتا ہے۔[۴۵] ختم اور تغشیہ حقیقی نہیں ہیں بلکہ انہیں استعارتاً ختم اور تغشیہ کا نام دیا گیا ہے۔[۴۶] یعنی جب ان کے نفوس کی ایسی حالت ہو جائے کہ وہ کفر و معصیت کی طرف خود بخود دوڑے اور ایمان اور اطاعت سے دور ہو ان کی نظر صحیح دیکھنے سے اعراض کرنے لگے اور ان کے دل میں حق نافذ نہ ہو تو ایسی صورت کے اظہار کے لیے ختم اور تغشیہ کا لفظ استعارتاً استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ مولانا اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

> لا ختم علی الحقیقة وانما المراد به ان یحدث فی نفوسهم هیئة تمرنهم علی استحباب الکفر والمعاصی واستقباح الایمان والطاعات بسبب غیهم وانهماکهم فی التقلید واعراضهم عن

النظر الصحیح فتجعل قلوبھم بحیث لا یوثر فیھا الانذار ولا ینفذ فیھا الحق اصلاً وسمی ھذہ الھیئۃ علی الاستعارۃ ختماً۔(۴۷)

یہاں ''ختم''(مہر)حقیقتاً نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان کے دلوں میں ایسی ہیئت کا ظہور ہے جو انہیں کفر و معاصی کے استحباب اور ایمان واطاعت کے استقباح کا خوگر بنادے اور یہ انکار، تقلید میں انہماک اور صحیح النظر سے عاری ہونے کے سبب ہے۔اب ان کی حالت یہ ہے کہ انذار و ترہیب ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں نہ حق داخل ہوتا ہے۔اس حقیقت کو استعارۃً ختم کا نام دیا گیا ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے منکرین اسلام کی تصویر کشی ایک عمدہ اور بلیغ اسلوب میں کی ہے تاکہ مخاطب کے سامنے ان کی واضح تصویر سامنے آجائے۔سید قطب کے نزدیک یہ نہایت سخت،تاریک اور جامد تصویر ہے جو ان لوگوں کے دل ودماغ کی گہری تاریکی وسیاہی اور مسلسل اندھے پن اور بہرے پن کی روش اختیار کرنے کی وجہ سے منقش ہو کر ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔(۴۸)

{وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا}(۴۹)

اور ہر انسان کو ہم نے لازم کر دیا اس کے لیے اس کا عمل اس کی گردن میں،اور ہم نکالیں گے اس کے لیے قیامت کے دن ایک کتاب وہ پائے گا اسے کھلی۔

آیت میں انسان کے خیر وشر کے عمل کے لیے استعارۃً(طائر)کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔عرب اپنے ہر کام کا نیک وبد انجام طائر یعنی پرندوں کی پرواز سے معلوم کرتے تھے اگر دائیں سے اڑاؤ تو خیر اور بائیں سے اڑاؤ تو شر وغیرہ پھر جب اس کا استعمال زیادہ ہوا تو ہر خیر وشر کو طائر کہنے لگے۔(۵۰)یعنی عرب کی عادت کے مطابق شگون کو طائر کہا گیا ہے کیونکہ وہ پرندوں کے بائیں سے دائیں اڑنے اور دائیں سے بائیں اڑنے سے شگون اور فال پکڑتے تھے کہ امام بغوی لکھتے ہیں:(وسمی طائر علی عادۃ العرب فیما کانت تتفاء ل وتتشاء م بہ من سوانح الطیر وبوارحھا)(۵۱)''عربوں کی عادت کے مطابق جس سے فال یا شگون پکڑتے اسے طائر کا نام دیتے اور پرندوں کے دائیں بائیں اُڑنے سے شگون پکڑتے۔''

اس لیے عرب کے رواج میں خیر وشر کے اعمال متعلق جو لفظ معروف تھا اسے ان کی فہم سے قریب تر کرنے کے لیے آیت میں استعارۃً لایا گیا ہے۔یعنی(طائر)سے انسان کے عمل کو تشبیہ دی ہے یا طائر کو اس کے لیے مستعار لیا گیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

استعيرا الطائر بعمل الانسان لان العرب الذين كانوا يتفألون ويتشائمون بالطير سموا نفس الخير والشر بالطائر بطريق الاستعارة(۵۲)

لفظ طائر کو عمل انسانی کے لیے مستعار لیا گیا ہے کیونکہ عرب طائر سے تفائل اور تشاؤم لیتے۔ پھر خیر اور شر کو بطور استعارہ طائر کہنے لگے۔

چنانچہ اس آیت کے معنی مراد لیے گئے ہیں وہ حضرت ابن عباس کے مطابق: (عمله وما قدر عليه فهو ملازمه اينما كان)(۵۳)"انسان کا عمل جو اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے وہ جہاں بھی جائے وہ اس کے ساتھ ہوئے ہیں۔" کلبی اور مقاتل کے نزدیک: (خير و شره معه لا يفارقه حتى يحاسبه به)(۵۴)"خیر و شر انسان کے ساتھ رہتے ہیں اس سے جدا نہیں ہوتے حتیٰ کہ اس کا محاسبہ ہو جائے۔"اہل معانی کے نزدیک طائر سے مراد وہ فیصلہ ہے جو کیا جا چکا ہے کہ یہ شخص یہ عمل کرے گا۔(۵۵)

یعنی ہر انسان کا (طائر) شگون اس کا عمل ہے جو اس کی قسمت میں لکھا ہے اس سے مراد خود انسان کا جو عمل ہے اور اس کے گلے میں لٹکانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا شگون یعنی اعمال کبھی جدا نہیں ہوتے۔(۵۶) ایسی جدا نہ ہونے والی چیزوں کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں چیز اس کے گلے میں پڑ گئی۔(۵۷) جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے لیے گلے میں نوشتہ سعادت یا شقاوت لٹکا ہوتا ہے۔(۵۸) یہ قرآن کریم کا طریقہ ہے کہ وہ اپنے معانی و مفاہیم کو بھی ایک محسوس صورت میں پیش کرتا ہے یعنی یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے اعمال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اسی طرح قیامت کے دن کتاب منشور سے اخراج کا مفہوم اس کے اعمال کا ظاہر ہونا ہے۔ یعنی اعمال کھلی صورت میں ہوں گے، کوئی چھپا نہ سکے گا، اس میں کوئی مغالطہ نہ ہو گا، قرآن اسے کھلی کتاب کی مجسم صورت میں پیش کرتا ہے جس سے نفس اور احساس پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانی خیال یک دم پرندے اور کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، وہ اس سخت دن کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ جس میں تمام راز کھل جائیں گے، کسی گواہ اور محاسب کی ضرورت نہ ہو گی۔(۵۹)

الغرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عرب کو مخاطب کیا ہے جسے وہ پہچانتے تھے، اس کا ذکر کیا ہے چنانچہ وہ پرندے سے اچھا اور برا شگون لیتے تھے اس کا نام ہی تطیر اَپڑ گیا یعنی ان کا اعتقاد تھا کہ یہ پرندہ فیصلہ کرتا ہے جو انسان کو اچھائی یا برائی ملی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مختصر اور بلیغ لفظ سے اشارہ کیا ہے کہ جو کچھ انسان کو ملتا ہے خیر و شر میں سے اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے جیسا کہ ابن عطیہ اندلسی نے ابن عباس کے حوالے سے لکھا ہے:

وخاطب الله العرب فی هذه الایة لما تعرف، وذلک انه کان من عادتها التیمن والتشاؤم بالطیر فی کونها سانحة وبارحة وکثر ذلک حتی فعلته بالظبا وحیوان الفلاة، وسمیت ذلک کله تطیرًا، وکانت تعتقد ان تلک الطیرة قاضیه بما یلقی الانسان من خیر و شر، فاخبرهم الله تعالی فی هذه الایة فی اوجز لفظ وابلغ اشارة ان جمیع ما یلقی الانسان من خیر و شر قد سبق به القضاء۔ والزم حظة وعمله وتکسبه فی عنقه(۶۰)

ذیل کی آیات میں بہت خوبصورتی سے بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی کو بیان کرنے کے لیے استعاراتی اسلوب میں بات کی جاتی ہے کہ بجائے یہ کہنے کہ قبول حق کی استعداد ان میں ختم ہوگئی ہے یا ان کے دلوں سے اثر پذیری کی صلاحیت سلب ہوگئی ہے اور وہ حق بات کا اثر نہیں لیتے۔ صرف یہ کہہ دیا(ثم قست قلوبکم) یعنی ''پھر ان کے دل سخت ہوگئے''اس طرح استعاراتی اسلوب میں انتہائی مختصر اور بلیغ الفاظ میں مخاطب کے سامنے دلوں پر اثر نہ کرنے کے حوالے سے ایسا واضح تصور پیش کر دیا جس سے حق کو نہ ماننے والوں کی حالت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : {ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً} (۶۱)''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اس کے بعد تو وہ ہیں پتھروں کی مانند یا (ان سے بھی) زیادہ سخت۔''لغت میں قَسَا قلبه قسوًا قساوة وهو غلظ القلب وشدته (۶۲)سخت ہونا، دل کے ساتھ آئے تو معنی دل کا سخت ہو جانا، رحمت نرمی سے خالی ہو جانا اور وہ قاس اور قاسیہ ہے؛اَلْقَسوة: ہر شے کی سختی، بے رحمی دل کی سختی۔ (۶۳)امام راغب کے نزدیک القسوة کے معنی سنگ دل ہونے کے ہیں یہ اصل میں حَجَرٍ قَاسٍ سے ہے جس کا معنی سخت پتھر کے ہیں۔ (۶۴) {فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ } (۶۵)''چنانچہ ہلاکت ہے ان کے لیے کہ سخت ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے۔'' {وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً} (۶۶)''اور ہم نے کر دیا ان کے دلوں کو سخت۔''

دلوں کی سختی کا حدیث مبارک میں بھی ذکر آیا ہے کہ جس کی وجہ سے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

((عن ابن عمرؓ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لا تُكْثِرِ الْكَلَامَ بغیر ذِكْرِ اللّٰهِ فَاِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ وَاِنَّ اَبْعَدَ النَّاسَ مِنَ اللّٰهِ اَلْقَلْبُ الْقَاسِی)) (۶۷)''روایت ہے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ذکر کے بغیر کلام زیادہ نہ کرو۔ اس لیے کہ اللہ کے ذکر کے بغیر کثرت کلام دل کی سختی کا سبب ہے۔ لوگوں میں اللہ سے زیادہ دور سخت دل والا ہے۔'' {ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ} کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں: ({ قَسَتْ }ای صلبت و جفت ، وهی عبارة عن خلوها مِن الإنابة

والاذعان لایات اللہ تعالیٰ)[۶۸]"ان کے دل سخت اور خشک ہو گئے اور ایسا دراصل انابت الٰہی اور آیات اللہ کے سامنے فروتنی نہ اختیار کرنے کے باعث ہوا۔"

یہاں "ثُمَّ" کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ دین کے معاملے میں تمہاری اس قسم کی کٹھ حجتیوں اور فرار پسندیدیوں کا نتیجہ نکلا کہ تمہارے دل سخت ہو گئے۔[۶۹] معجزات اور واقعات کو دیکھ کر بھی بنی اسرائیل کے دلوں کے اندر انابت الی اللہ کا داعیہ اور توبہ واستغفار کا جذبہ پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس دل پتھر کی طرح سخت بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ دلوں کا سخت ہو جانا یہ افراد اور امتوں کے لیے سخت تباہ کن اور اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ دلوں سے اثر پذیری کی صلاحیت سلب اور قبول حق کی استعداد ختم ہو گی اس کے بعد اس کی اصلاح کی توقع کم اور مکمل فنا اور تباہی کا اندیشہ زیادہ ہو جاتا ہے۔[۷۰] اسی لیے اہل ایمان کو خاص طور پر تاکید کی گئی ہے: {وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ} [۷۱]"اور نہ ہوں وہ مانند ان لوگوں کے جنہیں دی گئی کتاب اس سے پہلے پھر لمبی ہو گئی ان پر مدت تو سخت ہو گئے ان کے دل۔"

چنانچہ القسوۃ جس کے اصل معنی شدت اور سختی کے ہیں لیکن دلوں کی حالت اور کیفیت کو تشبیہ دینے کے لیے قسوۃ کو بطور استعارہ لایا گیا ہے جیسا کہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں: (القسوہ فی الاصل الیبس والصلابۃ وقد شبہت ھنا حال قلوبھم وھی نبوھا عن الاعتبار بحال قسوۃ الحجارہ فی انھا لا یَجْری فیھا لطف العمل ففی (قست) استعارۃ تبعیہ[۷۲] او تمثیلیۃ)[۷۳] "قَسْوَۃ دراصل خشکی اور سختی کا نام ہے۔ ان کے دلوں کی حالت جو انکار سے عبارت ہے، کو پتھروں کی سختی سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ وہ بھی پتھروں کی طرح لطف عمل کے فیضان سے محروم ہیں۔ قَسَتْ میں استعارہ تبعیہ اور تمثیلیہ ہے۔" صاحب کشاف لکھتے ہیں: (صفۃ القلوب بالقسوۃ والغلظ مثل لنبوھا عن الاعتبار وان المواعظ لو توثر فیھا)[۷۴] الغرض قساوت غلظت اور سختی کو کہتے ہیں جیسا کہ پتھر میں ہوتی ہے کہ اس میں خوف وعبر کی جگہ نہ رہے کہ گناہ کرتے کرتے بنی اسرائیل کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے جس طرح پتھر میں اثر نہیں ہوتا اسی طرح ان کے دلوں میں انبیاء کی نصیحت اثر نہیں کرتی۔[۷۵]

پہلے قساوت قلبی کا ذکر کیا اور پھر مزید قساوت کی شدت کو بیان کرنے کے لیے تشبیہ بھی دے دی اور پھر یا کر کے اس کی شدت کو مخاطب پر چھوڑ دیا کہ وہ اس کی شدت کو اس سے سخت چیز سے تشبیہ دے دے۔

{فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَوَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُفَكُّ رَقَبَةٍاَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ} (۷۶)

پھر نہیں وہ داخل ہوا دشوار گھاٹی میں پھر کس چیز نے خبر دی آپ کو کیا ہے وہ دشوار گھاٹی وہ چھڑانا ہے گردن کا یا کھانا کھلانا ہے ایسے دن میں جو بھوک والا ہے۔''

لفظ (عَقَبَۃٌ) کو نیکی کے دشوار راستے اور نیک اعمال کے لیے بطور استعارہ لایا گیا ہے جو نفس پر شاق گزرتے ہیں۔ ''قَحَمَ یعنی رمی بنفسہ فی عظیم''یعنی اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا،اقتحم الامر: بغیر سوچے سمجھے کسی کام میں لگنا۔(۷۷)''العقبۃ'' کے معنی پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ۔(۷۸) یقال اقتحم فلانٌ عقبۃ او وھدۃ: کہا جاتا ہے کسی گھاٹی یا گڑھے کو پار کرنے کا خطرہ مول لینا۔ (۷۹)یعنی دشوار گزار گھاٹی میں داخل ہونا دراصل اخلاقی بلندیاں ہیں اور ان پر چڑھنے کا راستہ دشوار گزار اس لحاظ سے ہے کہ ایسے راستے عموماً انسان کی خواہش کے خلاف اور طبیعت کے لیے ناگوار گرانبار ہوتے ہیں۔(۸۰) اس لیے عقبہ سے مراد نیکی کا دشوار گزار راستہ ہے،اس دشواری اور بلندی کی وجہ سے راہ ہدایت کو عقبہ سے بطور تمثیل کے بیان کیا ہے یعنی استعارہ ہے۔(۸۱)

امام بیضاوی اس حوالے سے لکھتے ہیں: (باقتحام العقبۃ وھو الدخول فی امر شدید، العقبۃ الطریق فی الجبل استعارھا بما فسرھا بہ من الفک والاطعام فی قولہ)(۸۲)''گھاٹی کو عبور کرنے سے مراد مشکلات و شدائد کا سامنا کرنا ہے۔ عقبہ (گھاٹی) ایک پہاڑی راستہ ہے اور اسے گردنیں چھڑانے اور مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے مستعار لیا گیا ہے۔''ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں: (فی ھذہ الایۃ علی عرف کلام العرب، استعارۃ لھذا العمل الشاق علی النفس من حیث ھو بذل مال تشبیہ بعقبۃ الجبل، وھی ما صعب منہ وکان صعودًا)(۸۳)''اس آیت میں کلام عرب کے عرف کے مطابق نفس پر شاق گزرنے والے عمل یعنی مال خرچ کرنے کو گھاٹی عبور کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ اس کے لیے استعارہ ہے بلندی کی وجہ سے گھاٹی کا عبور کرنا مشکل ہوتا ہے۔''شیخ حسین محمد مخلوف اس ضمن میں لکھتے ہیں: (والعقبۃ فی الاصل : الطریق الوعرُ فی الجبل، استُعیرت للاعمال المذکورہ لصعوبتھا علی النفوس)(۸۴)''عقبہ''دراصل پہاڑ میں دشوار گزار راستہ ہے اور اسے مذکورہ اعمال کے لیے مستعار لیا گیا ہے کیونکہ ان کی ادائیگی نفوس پر گراں گزرتی ہے۔''امین احسن اصلاحی رقمطراز ہیں: ''(عَقَبَۃٌ) کے معنی گھاٹی اور (اقتحام) کے معنی چڑھائی چڑھنے یا کوئی مشکل کام کرنے کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے نیکی کے ان کاموں کی طرف اشارہ ہے جو ہمدردی خلق اور بندگی رب کے نہایت اعلیٰ کام ہیں اور جن کی بعض مثالیں آگے مذکور ہیں۔ان کاموں کو

انجام دینے کے لیے چونکہ انسانوں کو ایثار وقربانی سے کام لیناپڑتا ہے جو انسان پر شاق ہے اس وجہ سے اس کو ''اقتحام عقبۃ''(گھاٹی پار کرنے سے) تعبیر فرمایا۔ یہاں وہ حقیقت ملحوظ رہے... کہ جتنے بھی اعلیٰ کام ہیں ان کے لیے چونکہ نفس کو اس کی نقد لذتوں سے موڑ کر بالکل مختلف سمت میں لے جانا پڑتا ہے اس وجہ سے وہ بہت شاق گزرتے ہیں۔ اس کے برعکس ادنیٰ کاموں کی لذتیں نقد ہیں اس وجہ سے نفس ان کی طرف فوراً چل پڑتا ہے۔''(۸۵)

الغرض دیکھا جاسکتا ہے کہ کس عمدگی سے انتہائی مختصر الفاظ میں انسان کو نیکی کے راستے کی طرف چلنے پر آمادہ کیا جارہا ہے۔ دشوار گزار گھاٹی جس کو عبور کرنے کی ہمت انسان نہیں کرتا لیکن جو لوگ اپنے پختہ ایمان سے مدد لیتے ہیں اور انسان اسے عبور کرلے تو وہ سیدھا جنت میں داخل ہو جائے۔(۸۶) یہاں قرآن کریم اس کی منظر کشی اس طرح کرتا ہے کہ انسان کے دل میں اسے عبور کرنے کا نہ صرف جوش پیدا ہو، بلکہ تحریک بھی پیدا ہو کہ وہ اسے پار کرلے اور پار کرنے کے لیے ایک جست ہی کافی ہو۔ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے اور یقین دلایا گیا ہے کہ یہی یعنی گھاٹی تمہارے اور اس کے (یعنی جنت) درمیان حائل ہے۔(۸۷)

{وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ}(۸۸)

''اور جب تارے بکھر جائیں گے۔''

قیامت کے ایک منظر کو بہت خوبصورتی کے ساتھ استعاراتی زبان میں بیان کیا ہے، تاکہ آنکھوں کے سامنے ایک حقیقی تصویر واضح ہو جائے۔ چنانچہ قیامت کے وقت ستاروں کی جو حالت ہوگی اسے جواہر اور ذرات سے تشبیہ دی ہے جو جھاڑنے سے بکھر جاتے ہیں، انتثر کو اکب بکھرنے کے لیے مستعار لیا گیا ہے۔ نثَرَ : نثَرَ الشی نَشْرَہٗ وتفریقُہٗ: کسی چیز کو بکھیرنے اور پراگندہ کردینے کے ہیں اور انتثر (انفعال کے وزن پر) معنی بکھر جانے کے ہیں۔(۸۹) نثر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے جھڑ کر پراگندہ ہو جائے(۹۰) اِنْتِثَار ناک جھاڑنے کو کہتے ہیں یعنی جس طرح ناک کی رطوبت کے اجزا نہایت بے ترتیبی سے جھڑ کر زمین پر ادھر ادھر جا پڑتے ہیں بس یہی اس لفظ کا معنی ہے۔(۹۱) جسے ستاروں کے بکھرنے کے لیے مستعار لیا گیا ہے کہ ستارے بھی اسی طرح بکھر جائیں گے جس طرح اجزا نہایت بے ترتیبی سے جھڑ کر زمین پر ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں: (ای تساقطت متفرقۃ وھو استعارۃ لازالتھا حیث شبھت بجواھر قطع سلکھا)(۹۲)''یعنی گر کر بکھر جائیں۔ یہ ان کے زائل ہونے کے لیے استعارہ ہے۔ یعنی

ستاروں کو لڑی ٹوٹنے اور جواہر کے بکھرنے سے تشبیہ دی ہے۔''محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:(شَبّہ الکوکب بجواھر قطع سلکھا فتناثرت متفرقہ ، وطوی ذکر المشبہ ورمزلہ شیء من لوازمہ وھو الانتثار علی طریق الاستعارۃ المکنیہ)[۹۳]''کواکب کو جواہر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کی لڑی ٹوٹ جانے سے اِدھر اُدھر بکھر جائیں۔ مشبّہ بہ کا ذکر نہیں کیا گیا اس کے لیے اس چیز کو بطور رمز استعمال کیا گیا ہے جو اس کے لوازم میں سے ہے یعنی''انتثار'' بکھرنا اور یہ استعارہ مکنیہ کے طور پر ہے۔''

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا {[۹۴]

''اے ہمارے رب ڈال دے ہم پر صبر۔''

'' اَفْرِغْ'' لفظ صبر کے جاری کرنے کے لیے مستعار لیا گیا کہ جسے برتن سے پانی انڈیلا جاتا ہے ویسے ہی صبر انڈیلنا یا ڈالنا کہا گیا یعنی صبر کو پانی کی طرح بنا دیا ہے جیسا کہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:(وفیہ جعل الصبر بمنزلۃ المائِ)[۹۵]''اور اس (آیت) میں صبر کو ''پانی'' کی جگہ رکھا گیا ہے۔''اَفْرِغَ لغت کی رو سے ہے: فَرِغَ الشیئُ- فراغًا و فروغًا :یعنی خالی ہونا۔اَفْرَغَ الاناءَ برتن خالی کرنا۔اَفْرغ الشی : برتن وغیرہ سے کوئی چیز انڈیلنا۔[۹۶]ڈول سے پانی بہا کر اسے خالی کر دینا اسی سے مستعار ہے (اَفْرِغْ علینا صبرًا) جیسا کہ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:(وَاَفْرَغْتُ الدَّلْوَ صَبَبْتُ مَا فِيْهِ وَمنہ استعیر □ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا □)[۹۷]''وَاَفْرَغْتُ الدَّلْوَ ''یعنی اس میں جو کچھ ہے اسے میں نے انڈیل دیا پھر □ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا □ اس سے مستعار لیا گیا ہے۔''ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں: (فیہ استعارۃ تمثیلیہ فقد شبہ حالھم واللہ تعالیٰ یفیض علیھم بالصبر، بحال الماء الذی یصیب علی الجسم کلہ)[۹۸]''اس میں استعارہ تمثیلیہ ہے۔ ان پر فیضان صبر کی حالت کو پانی کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جسے پورے جسم پر انڈیل دیا جائے۔''

سید قطب شہید کے نزدیک یہ ایسی تعبیر ہے جس سے صبر کے فیضان کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اللہ کی طرف سے فیضان اس طرح ہوتا ہے جس طرح ایک برتن بھر کر ان پر انڈیل دیا جائے اور ان کے دل کا پیالہ اس سے لبریز ہو جائے۔[۹۹]قرآن کریم کے خوبصورت استعارے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کس عمدگی اور بلیغانہ انداز سے اپنے مخاطب کو معنی کا ادراک عطا کرتا ہے کہ اس کے سامنے پوری تصویر واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اور یہی قرآن کا مقصد ہے کہ اپنے سامع و قاری تک آیات کا ابلاغ بھرپور ہو۔

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ} [۱۰۰]

اے لوگو! تم کھاؤان (چیزوں) میں سے جو زمین میں ہیں حلال پاکیزہ، اور مت
پیچھے چلو تم شیطان کے قدموں کے۔

کیونکہ گناہ معاصی اور تمام منکر اعمال شیطان کے ہیں اس لیے شیطانی اعمال، گناہ اور منکرات سے بچنے کا کہنے کی بجائے استعارتاً کہہ دیا{ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ} کہ تم شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔یعنی گناہ کا ذکر کرنے کی بجائے {خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ} ''شیطان کے قدم''استعارتاً کہا گیا، تاکہ تمام منکرات کے حوالے سے مخاطب کے تصور میں یہ بات واضح ہو جائے کہ منکرات پر عمل کرنا ایسا ہے جیسا شیطان کے قدموں کی پیروی کرنا۔ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:(استعارة عن الاقتداء به واتباع آثارهِ ...وهي ابلغ عبارة عن التحذير من طاعته فيما يامر به وقبول قوله فيما يدعو اليفعله۔)[۱۰۱]''{خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ} شیطان کی اقتداء کرنے اور اس کے نقش قدم کا اتباع کرنے کے لیے استعارہ ہے...اور یہ امر اس کی اطاعت اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے روکنے کے لیے زیادہ بلیغ ہے۔''امام بیضاوی{ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ} کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (لا تقتدوا به في اتباع الهوى فتحرموا الحلال وتحللوا الحرام)۔[۱۰۲]''اتباع ھوی میں اس کی (شیطان) کی تقلید نہ کرو کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال گردانے لگو۔'' خُطْوَةُ : لغت کی رو سے اس کے معنی دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے۔[۱۰۳]ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں:((خطوات) جمع خطوة وهي مابين القدمين في المشي فالمعنى انهى عن اتباع الشيطان وسلوك سبيله وطرائقه)[۱۰۴]''خطوات، خطوہ کی جمع ہے اور یہ دو قدموں کے درمیان فاصلے کا نام ہے۔ مراد یہ ہے کہ شیطان کا اتباع کرنے اور اس کے راستے اور طریقے پر چلنے سے منع کیا گیا ہے۔''حسین محمد مخلوف لکھتے ہیں:(اصلها ما بين القدمين، ثم استعيرت لما ذكر)[۱۰۵]''اس کی اصل (خطوات کی اصل) دو قدموں کے درمیان فاصلہ ہے۔ پھر جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے (شیطان کی پیروی) کے لیے مستعار لے لیا گیا۔''قتادہ نے کہا:(''كل معصية اللهِ فهي من خطواته)[۱۰۶]'' اللہ کی ہر طرح کی نافرمانی، شیطان کے قدموں کے نشان ہیں۔''

الغرض قرآن کریم اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لیے بہت خوبصورتی سے ایسے الفاظ استعارتاً لاتا ہے جو مخاطب کو اس بات کا معنی بہت عمدگی سے سمجھا دیتی ہے جیسا کہ خطوۃ کے لفظ نے شیطان کے تمام اعمال کو بہت خوبی سے واضح کر دیا۔

{هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ}[۱۰۷]

وہ لباس ہیں تمہارے لیے اور تم لباس ہو ان کے لیے۔

میاں بیوی کے باہمی تعلق کو استعارتاً بہت خوبصورتی سے لباس کے ساتھ تشبیہ دے کر بیان کیا گیا ہے۔ لباس انسان کو ڈھانپ لیتا ہے اور پردہ پوشی کا باعث بنتا ہے اور اسے محفوظ رکھتا ہے۔ زیب و زینت دیتا ہے۔ اس سے انسان سکون حاصل کرتا ہے جیسا کہ لباس کے مفہوم سے واضح ہوتا ہے۔ لَبِسَ کے معنی پہننے کے ہیں۔ اَللِّبَاسُ واللَّبُوْسُ واللَّبْسُ : وہ چیز جو نہی جائے۔[۱۰۸] قرآن پاک سے بھی لباس کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ {قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ}[۱۰۹] "تحقیق ہم نے اتارا تم پر (ایسا) لباس جو چھپاتا ہے تمہاری شرم گاہیں۔" لباس : لَبْسٌ سے مشتق ہے جس کے معنی کس چیز کو چھپانے کے ہیں۔ لباس کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو انسان کے برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔ چنانچہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو برائیوں کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔[۱۱۰] لِبَاسٌ اصل میں کپڑے میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر میاں بیوی کے امتزاج کو لباس کہا گیا کیونکہ وہ باہم متصل ہو جاتے ہیں کپڑے کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں: (واللباس اصلہ فی الثیاب ثم شبہ التباس الرجل بالمراۃ وامتزاجھا وتلازمھا)[۱۱۱] "لباس حقیقت میں ثیاب (کپڑوں) کے لیے بولا جاتا ہے پھر مرد کے عورت کے ساتھ خلط ملط ہونے، گھلنے ملنے اس کا ساتھ لازم پکڑنے کے لیے بطور تشبیہ استعمال کیا جانے لگا۔" جیسا کہ نابغہ الجعدی نے کہا:

اِذَا مَا الضَّجِيْعُ ثَنَى جِيدَهاتَدَاعَتْ فَكَانَتْ عليہ لباسا[۱۱۲]

یعنی جب پہلو میں سونے والے نے اس کی گردن دوہری کی اسے بلایا تو وہ اس پر لباس تھی۔ ابو عبیدہ نے کہا: (یقال للمراۃ ھی للباسک وفراشک وازارک)[۱۱۳] "یعنی عورت کو کہا جاتا ہے یہ تیرا لباس ہے، تیرا بستر ہے اور تیرا ازار ہے۔" ربیع بن انس نے کہا: (ھن فراش لکم ، وانتم لحاف لھن)[۱۱۴] "وہ تمہارے لیے بستر ہے اور تم اس کے لیے لحاف ہو۔" میاں بیوی کو لباس سے تشبیہ دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے ایک دوسرے سے معانقہ کرنے اور باہم ملنے کی کیفیت ہے۔[۱۱۵] اور دوسری وجہ میاں بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لیے حرام سے پردہ بن جاتا ہے اور یہ کہ ہر ایک اپنے ساتھی کے لیے حقوق زوجیت ادا کرنے کی صورت میں لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہوتا ہے اس کیفیت کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے۔[۱۱۶] امام بغوی نے لکھا ہے : (اللباس اسم لما یواری الشئی)[۱۱۷] "لباس نام ہے جس سے کسی چیز کو چھپایا جاتا ہے۔" اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے لیے لباس بنایا ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ اس سے

مخصوص ہے جیسا کہ لباس اسی کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں:(انہ تعالیٰ جعلها لباساً للرجل، من حیث انہ یخصها بنفسہ، کما یخص لباسہ بنفسہ ، ویراها أهلاً لان یلاقی کل بدنہ کل بدنها کما یعملہ فی اللباس۔ ویحتمل ان یکون المراد سترہ بها عن جمیع المفاسد التی تقع فی البیت، لولم تکن المراۃ حاضرۃ ، کما یستتر الانسان بلباسہ عن الحر والبر وکثیر من المضار)[۱۱۸]"بے شک اللہ سبحانہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے لیے لباس قرار دیا ہے۔ جس طرح مرد لباس، اپنے لیے مخصوص کرتا ہے اسی طرح عورت کو اپنے لیے خاص کرتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ان تمام مفاسد سے بچنا ہو جو عورت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ظہور میں آتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسے لباس انسان کو گرمی سردی اور تکالیف سے بچاتا ہے۔"

لباس جہاں پردہ ہوتا ہے وہاں سکون کا باعث بھی ہوتا ہے اور میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے لیے سکون کا باعث ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بھی آیا ہے: {وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا} [۱۱۹]"اور اس نے بنایا اس سے اس کا جوڑا تاکہ وہ سکون حاصل کرے اس سے۔" جیسا کہ مجاہد اور سدی کا قول ہے: ((لباس) سکن، یسکن بعضهم الی بعض)[۱۲۰]یعنی بعض بعض سے سکون حاصل کرتے ہیں۔ابن عباس کا قول بھی ہے: (ای هن سکن لکم وانتم سکن لهن)[۱۲۱]یعنی وہ تمہارے لیے سکون ہیں اور تم ان کے لیے سکون ہو۔ امین احسن اصلاحی(هن لباس لکم وانتم لباس لهن)کے حوالے سے لکھتے ہیں:
"میاں اور بیوی کے لیے لباس کا استعارہ ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ اس سے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے جسم کے لیے سایہ ہوتا ہے۔ اس سے اس کے عیوب برہنگی کو پردہ پوش نصیب ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی ننگا ہو کر حیوانات کے درجے پر آجائے ٹھیک اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے جنسی جذبات و داعیات کے لیے پردہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کے اندر جو صنفی میلانات ابھرتے ہیں وہ ان کی تسکین اور آسودگی کے لیے خود اپنے اندر سامان رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے کبھی ان کے عریاں اور بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ نفس کے اگر سارے عیوب کی پردہ پوشی ہو سکتی ہے تو صرف بیوی کے لیے شوہر کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اور شوہر کے لیے بیوی کے ذریعہ سے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے نگاہ کو باحیا بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز نکاح کو قرار دیا ہے[۱۲۲]... حیا خود ایک باطنی لباس ہے بلکہ اصلی لباس یہی ہے، باطن کا یہی لباس ہے جس کے سبب سے ہم ظاہر کے لباس کو

اختیار کرتے ہیں اور حیا قائم رکھنے میں جو مدد شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ملتی ہے وہ کسی چیز سے بھی نہیں ملتی۔"[۱۲۳]

الغرض مرد و عورت کے باہمی تعلقات کو انتہائی خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے (دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے) یعنی جسے وہ تمہارے لیے لباس ہے ویسے ہی تم ان کا لباس ہو اس لحاظ سے دونوں کے حقوق و فرائض مساوی ہیں پھر لباس کی تفسیر کتنی معنی خیز ہے؟ مختصراً الفاظ میں لباس پردہ ہے ہر عیب کو چھاتا ہے۔ زینت ہے حسن و جمال کو نکھارتا ہے۔ راحت ہے سردی و گرمی سے بچاتا ہے کیا ایک اچھی بیوی اپنے خاوند کے لیے اور ایک اچھا خاوند اپنی بیوی کے لیے پردہ زینت اور راحت ہیں؟ یقیناً ہے جس ملت کے ہر گھر میں زوجیت کا یہ بلند تصور اور اعلیٰ معیار ہو اس کے لیے یہ دنیا جنت نہیں تو اور کیا ہے۔[۱۲۴]

{الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ }[۱۲۵]

"وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ کا عہد اس کے پختہ کر لینے کے بعد۔"

درج بالا آیت میں عہد شکنی کے لیے نَقْضُ کا لفظ بطور استعارہ لایا گیا۔ لغت کی رو سے اَلنَّقْضُ : یہ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا شیرازہ بکھرنے کے ہیں۔[۱۲۶] نَقَضَ الشَّیُٔ - نَقْضًا: بنا کر توڑنا، نَقْضُ الْبَنَاء : عمارت کو ڈھانا، منہدم کرنا۔نَقْضُ الحبل: رسی کے بل کھول دینا، بل اتارنا۔النقضُ : ٹوٹی ہوئی چیز۔[۱۲۷] نَقَضَ کا مترادف نَکَثَ بمعنی بٹی ہوئی یا بنی ہوئی چیز کو ادھیڑنا ہے۔[۱۲۸] نکث اور نقض قسم اور عہد شکنی کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔[۱۲۹] جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے: {اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ }[۱۳۰] "بھلا تم ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا۔"

لیکن نَقَضَ ، نَکَثَ سے زیادہ عام اور ابلغ بھی ہے اور اس عہد یا قسم کو توڑنے کے لیے آتا ہے جو پختہ کیا جا چکا ہو۔[۱۳۱] جیسا کہ ذیل کی آیات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ عہد کی پختگی کا اظہار لفظ توکید اور میثاق کے کے ذریعے ہو رہا ہے: {وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا }[۱۳۲] "اور تم پورا کرو عہد اللہ کا جب تم آپس میں عہد و پیمان کرو اور نہ تم توڑو (اپنی) قسمیں ان کو پختہ کر لینے کے بعد۔" اور زیر بحث آیت میں آیا ہے: {الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ }[۱۳۳] "وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ کا عہد اس کے پختہ کر لینے کے بعد۔" یہاں یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ قرآن کریم اپنے اسلوب میں الفاظ بھی وہ لاتا ہے جن کا اس جگہ تقاضا ہوتا ہے جیسا کہ آیت سے ظاہر ہے کہ یہاں اللہ سے کیے گئے ایسے عہد کو

توڑنے سے منع کیا گیا ہے جسے پختہ باندھا گیا تھا جس کے لیے میثاق کا لفظ آیا ہے۔اس لیے یہاں نَقَضَ کا لفظ آیا ہے۔ جسے بڑی خوبصورتی سے عہد کے لیے استعارتاً لایا گیا ہے۔ کیونکہ اَلنَّقْضُ کا معنی رسی کی ترکیب کو الگ الگ کرنا ہے، عہد کے ابطال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ عہد کے لیے رسی کو استعارۃ استعمال کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ معاہدہ کرنے والوں کے درمیان بھی رسی کے اجزاء کی طرح ربط ہوتا ہے جیسا کہ ذیل کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے۔

النقض : فسخ التركيب ، واصله فى طاقات الحبل ، واستعماله فى ابطال العهد من حيث ان لعهد يستعار له الحبل لما فيه من ربط احد المتعاهدين بالآخر (۱۳۴)

"النقض" ترکیب کو فسخ کرنا ہے اور یہ حقیقۃً حبل یعنی رسی کے لیے ہوتا ہے۔ عہد کا ابطال کرنے کے لیے اس کا استعمال ایسی صورت میں ہے جب حبل کو عہد کے لیے مستعار لے لیا جائے۔ کیونکہ عہد میں بھی متعاھدین کے درمیان ایک دوسرے سے ربط پایا جاتا ہے۔

صاحب کشاف کے نزدیک:(تسميتهم العهد بالحبل على سبيل الاستعار ، لما فيه ثبات الوصلة بين المتعاهدين)(۱۳۵)"عہد کو حبل کا نام استعارہ کے طور پر دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بھی ربط موجود ہے۔ جس طرح متعاھدین کے درمیان ربط ہوتا ہے۔"

استعارہ ایک ایسا ادبی اسلوب ہے جو خطابت و نثر میں جان پیدا کرتا اور اس کیفوت تاثیر کو بڑھا دیتا ہے، اس سے ایک یا چند لفظوں سے کیفیت و کمیت اور ہیئت و معنویت سامع اور قاری کے ذہن میں نکھر کر ابھرتی ہے، اور پس منظر و پیش منظر کی جزئی تفصیلات تک تخیلاتی رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے عموماً تمام لسانیاتی ادب اور خصوصاً عربی لسانیاتی ادب میں اس کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے بھی اپنے مخاطب کو متاثر کرنے کے لئے نہایت اچھوتے انداز میں استعاراتی اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ قرآن کریم کے اس اسلوب کا مطالعہ بہترین نتائج دیتا ہے، قرآن کریم کے ابلاغی پہلوؤں بشمول استعارہ کو مفسرین نے بھی عمدگی سے واضح کیا ہے، قرآن حکیم میں مذہبی، معاشرتی اور اَخلاقی پہلوؤں پر جن استعارات کا استعمال کیا گیا ہے، وہ کلام اللہ ہی کی شان ہے۔

حوالہ جات و حواشی

(۱) ''وھو علم یعرف به ایراد المعنی الواحد بطرق مختلفه فی وضوح الدلالة علیه'' یعنی وہ علم ہے جس کے ذریعے ایک معنی کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جائے تاکہ لفظ کی اس معنی پر دلالت واضح ہو سکے۔القزوینی، علامه محمد عبد الرحمن، تلخیص المفتاح، مکتبه رشیدیه، کوئٹه، س۔ن، ص ۴۸؛الهاشمی، احمد بن ابراہیم بن مصطفی، جواہر البلاغة فی ادبیات وانشاء لغة العرب، موسسة الاعلی للمطبوعات، بیروت، الطبعة الأولی، ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء، ۱/ ۱۶۵

(۲) ''علم یعرف به الوجوہ والمزا یا التی تزید الکلام حسناً و طلاوة و تکسوبهاءً ورونقاً بعد مطابقته المقتضی الحال و وضوح دلالته علی المراد'' یعنی ایسا علم جس سے کلام کو حسن و خوبی اور تازگی و رونق کا لباس بخشنے والے اسباب و خصوصیات کی معرفت حاصل کی جا سکے۔ جبکہ وہ کلام حالات سے مطابقت رکھنے کے علاوہ معنی مراد پر واضح دلیل ہو۔ جوہر البلاغۃ، ۱/ ۲۳۲

(۳) الزبیدی، محب الدین ابی فیض السید محمد مرتضٰی، تاج العروس من جواہر القاموس، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء، ۲۷۶/۷؛ابراہیم مصطفی و رفقاۂ، المعجم الوسیط، دارالدعوة، ترکی، س۔ن، ص ۶۳۶

(۴) الراغب الاصفهانی، ابی القاسم الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء، ص ۳۶۸

(۵)تاج العروس، ۲۷۶/۷؛ المعجم الوسیط، ص ۶۳۶ (۶)المعجم الوسیط، ص۶۳۶

(۷)مُشَبَّه : جس کو تشبیه دی جائے، مُشَبَّه بِه: جس سے تشبیه دی جائےاداة مشبه: تشبیه کے لئے منتحب حروف، وجهتشبیه: تشبیه کا سبب

(۸)الاسعدی، مولانا محمد عبید الله، تسهیل البلاغة، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن، ص۶۷، جواہر البلاغة، ۱۹۷/۱

(۹)الجرجانی، امام عبدالقاہر، اسرار البلاغة فی علم البیان، المکتبة التوفیقیة، س۔ن، ص ۳۰

(۱۰)جرجانی، علی بن محمد، کتاب التعریفات، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء، ص ۲۴(۱۱)ایضاً

(۱۲) ابن قتیبه الدینوری، ابی محمد عبد الله بن مسلم، تاویل مشکل القرآن، دارالکتب العلمیه، بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء، ص ۸۸؛ ابن منظور الافریقی، ابی الفضل جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، دارصادر، بیروت، الطبعة الثالثة، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء(سماء)، ۳۹۷/۱۴؛ابن فارس، ابی حسین احمد، مقاییس اللغة، مکتب الاعلام الاسلامی، طهران، س۔ن، ۹۸/۳

(۱۳)ایضاً، ۸۸؛ ایضاً، ۳۹۷/۱۴؛ ایضاً، ۹۸/۳

(۱۴) السیوطی، جلال الدین بن عبد الرحمن بن ابی بکر، الاتقان فی علوم القرآن، مکتبة معارف، ریاض، الطبعة الثانیة، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۴ء، ۱۲۱/۲

(۱۵)ایضاً، ۱۲۷/۲ (۱۶)الزخرف ۴۳:۴

(۱۷)البغوی، الامام ابی محمد الحسین بن مسعود، معالم التنزیل، دار ابن حزم، بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء، ص ۱۱۶۴(۱۸)البروج۸۵: ۲۱، ۲۲

(۱۹) الزمخشری، ابو القاسم محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، داراحیاء التراث العربی، بیروت، الطبعة الثانیة، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء، ۴/ ۲۴۱

(۲۰)تفسیر البغوی، ص۱۱۶۴ (۲۱) لسان العرب، ۱۲/ ۲۸ (۲۲)المفردات، ص ۲۷

(۲۳) الفراھیدی، ابی عبد الرحمن الخلیل بن احمد، کتاب العین، داراحیاء التراث العربی، بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء، ص ۳۸

(۲۴) الاتقان فی علوم القرآن، ۲/ ۱۲۲ (۲۵) کیلانی، مولانا عبد الرحمن، تیسیر القرآن، مکتبة السلام، لاہور، ۱۴۳۲ھ، ۴/ ۱۵۳

(۲۶)بنی اسرائیل۱۷: ۲۴ (۲۷)المفردات، ص:۱۰۵

(۲۸) الالوسی البغدادی، شھاب الدین، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، الطبعة الاربعة، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء، ۱۵/۵۶؛ ابن عطیه اندلسی، قاضی ابو محمد عبد الحق بن غالب، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، دارالکتب العلمیة، بیروت،الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء، ۳/ ۴۴۹

(۲۹)الدکتور وھبه الزحیلی، التفسیر المنیر فی العقیدہ والشریعة والمنھج، دارالفکر، دمشق، الطبعة الثانیة، ۱۴۳۶ھ/۲۰۰۵ء

(۳۰)روح المعانی،۱۵/ ۵۶ (۳۱) المعجم الوسیط،ص۳۱۴؛ المفردات،ص۱۸۷

(۳۲) ایضاً، ۳۱۹؛ الجوھری الفارابی، ابو نصر اسماعیل بن حماد، الصحاح، داراحیاء التراث العربی، بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۹ء، ۱/ ۳۱۷

(۳۳) البیضاوی، ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بن محمد الشیرازی، انوار التنزیل و اسرار التاویل المعروف تفسیر البیضاوی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء، ۳/۲۵۲؛ الکشاف، ۲/ ۶۱۵، ۶۱۶

(۳۴) اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء، ۳/۷۴۰(۳۵)الاتقان فی علوم القرآن،۲/ ۱۲۲

(۳۶) الرازی، امام فخر الدین محمد بن عمر بن الحسین بن الحسن، التفسیر الکبیر او مفاتیح الغیب، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الثانیة، ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء، ۲۰/ ۱۵۳

(۳۷)البقرہ۲: ۷(۳۸)التفسیر المنیر، ۱/ ۸۲ (۳۹) روح المعانی،۱/ ۱۳۲

(۴۰)القرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، دارالحدیث، قاہرہ، ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء، ۱/ ۲۱۳

(۴۱)المعجم الوسیط،۳۱۸؛ الصحاح، ۴/ ۱۵۵۰(۴۲)پانی پتی، ثناء اللہ قاضی، التفسیر المظھری،ادارہ اسلامیات، لاہور،۱/ ۲۴

(۴۳) الواحدی، ابی الحسن علی بن احمد، الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، دار القلم، دمشق، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء، ۹۱/۱

(۴۴) الجامع لاحکام القرآن، ۱/ ۱۸۳، ۱۸۴ (۴۵) التفسیر المظهری، ۲۴/۱ (۴۶) تفسیر البیضاوی، ۴۲/۱

(۴۷) البروسی، الشیخ اسماعیل حقی، تفسیر روح البیان، دار احیاء التراث، بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء، ۷۴/۱

(۴۸) سید قطب، فی ظلال القرآن، دار الشروق، قاہرہ، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء، ۱۰/ ۴۲

(۴۹) بنی اسرائیل ۱۷:۱۳ (۵۰) روح المعانی، ۱۵/ ۳۱؛ تفسیر البیضاوی، ۲۵۰/۳؛ حقانی، عبد الحق، تفسیر حقانی، المکتبة العزیزیه، لاہور، س۔ن، ۵/ ۷۴

(۵۱) تفسیر البغوی، ص۷۳۸ (۵۲) التفسیر المنیر، ۸/ ۳۳ (۵۳) تفسیر البغوی، ۷۳۸ (۵۴) ایضاً

(۵۵) ایضاً، ۷۳۸ (۵۶) فی ظلال القرآن، ۴/ ۲۲۱۷ (۵۷) تفسیر البغوی، ۷۳۸ (۵۸) ایضاً

(۵۹) فی ضلال القرآن، ۴/ ۲۲۱۷ (۶۰) المحرر الوجیز، ۴۴۲/۳؛ التفسیر الکبیر، ۱۳۷/۲ (۶۱) البقرہ ۲:۷۴

(۶۲) الصحاح، ۵/ ۱۹۵۹ (۶۳) المعجم الوسیط، ۷۳۵؛ کتاب العین، ۷۸۹؛ تفسیر البغوی، ۴۳ (۶۴) المفردات، ۴۲۰

(۶۵) الزمر ۳۹:۲۲ (۶۶) المائدہ ۵:۱۳

(۶۷) الترمذی، محمد بن عیسیٰ، الجامع، دار السلام، ریاض، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء؛ ابواب الزهد، باب منه النهی، عن کثرة الکلام الابذکر الله، رقم الحدیث، ۲۴۱۱۰، ص ۵۴۹ (۶۸) المحرر الوجیز ۶۶/۱؛ الجامع لاحکام القرآن، ۲۴۱۷/۱ (۶۹) تدبر قرآن، ۲۰۶/۱

(۷۰) صلاح الدین یوسف، حافظ، تفسیر احسن البیان (اُردو)، دار السلام، لاہور، ص: ۳۳ (۷۱) الحدید ۵۷:۱۶

(۷۲) استعارہ تبعیہ جس میں لفظ مستعار غیر جامد ہو خواہ اسم ہی نہ ہو یا اسم تو ہو مگر جامد نہ ہو۔ جبکہ استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار کوئی اسم جامد ہو، خواہ اسم جنس ہو یا مشابہ۔ اسم جنس دیکھئے: تسهیل البلاغة، ۷۳ (۷۳) روح المعانی، ۲۹۵/۱؛ تفسیر المنیر، ۲۱۱/۱

(۷۴) الکشاف، ۱۸۳/۱؛ تفسیر البیضاوی، ۸۸/۱ (۷۵) تفسیر حقانی، ۱۷۸/۱ (۷۶) البلد ۹۰: ۱۱ تا ۱۴

(۷۷) المعجم الوسیط، ۷۱۶، ۷۱۷؛ کتاب العین، ۷۷۰ (۷۸) ایضاً، ۶۱۳؛ ایضاً، ص۶۶۰؛ المفردات، ص۳۵۴

(۷۹) المعجم الوسیط، ص۷۱۷ (۸۰) تیسیر القرآن، ۶۴۴/۴، ۶۴۵ (۸۱) تفسیر حقانی، ۱۳۹/۸

(۸۲) تفسیر البیضاوی، ۳۱۴/۵؛ الصابونی، محمد علی، صفوة التفاسیر، دار القرآن الکریم، بیروت، الطبعة الخامسة، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء، ۵۶۲/۳

(۸۳) المحرر الوجیز، ۴۸۵/۵؛ روح المعانی، ۱۳۷/۳۰

(۸۴) مخلوف، الشیخ حسین محمد، صفوة البیان لمعانی القرآن، وزارة الاقاف و الشؤون الاسلامیه، کویت، الطبعة الثالثة، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء، ص۸۰۶

(۸۵) تدبر قرآن، ۳۷۵/۹، ۳۷۶ (۸۶) دیکھئے: البلد ۹۰: ۱۵ تا ۱۸ (۸۷) فی ظلال القرآن، ۳۹۱۱/۶ (۸۸) الانفطار ۸۲:۲

(۸۹) المفردات، ص۵۰۴؛ المعجم الوسیط، ص۹۰۰ (۹۰) کیلانی، مولانا عبد الرحمن، مترادفات القرآن، مکتبه السلام، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۹

(۹۱)المعجم الوسیط، ص۹۰۰؛ تیسیر القرآن، ۶۰۸/۴ (۹۲)روح المعانی، ۶۳/۳۰ (۹۳)صفوۃ التفاسیر، ۵۲۹/۳؛ التفسیر المنیر، ۴۶۸/۱۵

(۹۴)البقرہ ۲: ۲۵۰(۹۵)روح المعانی، ۱۷۰/۲ (۹۶)المعجم الوسیط، ص۶۸۴؛ کتاب العین، ص۷۳۹؛ الصحاح، ۱۰۹۳/۳

(۹۷)المفردات، ص۳۹۳ (۹۸)التفسیر المنیر، ۷۹۹/۲ (۹۹)فی ظلال القرآن، ۲۶۹/۱ (۱۰۰)البقرہ ۲: ۱۶۸

(۱۰۱)صفوۃ التفاسیر، ۱۱۵/۱؛ التفسیر المنیر، ۴۳۵/۲ (۱۰۲)تفسیر البیضاوی، ۱۱۸/۱ (۱۰۳)الصحاح، ۱۸۵۸/۵

(۱۰۴)المحرر الوجیز، ۲۳۷/۱ (۱۰۵)صفوۃ البیان لمعانی القرآن، ۳۹

(۱۰۶) القنوجی، ابی الطیب صدیق بن حسن بن علی الحسینی، فتح البیان فی مقاصد القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء، ۲۳۵/۱

(۱۰۷)البقرہ ۲: ۱۸۷ (۱۰۸)المفردات، ص۴۶۶ (۱۰۹)الاعراف، ۷: ۲۶ (۱۱۰)المفردات، ص۴۶۶

(۱۱۱)المحرر الوجیز، ۲۵۷/۱ (۱۱۲) ایضاً (۱۱۳)تفسیر البغوی، ص۹۶ (۱۱۴)ایضاً، ص۹۶ (۱۱۵)تفسیر البیضاوی، ۱۲۶/۱

(۱۱۶)التفسیر الکبیر، ۹۰/۵ (۱۱۷)تفسیر البغوی، ص۹۶ (۱۱۸)التفسیر الکبیر، ۹۰/۵، ۹۱

(۱۱۹)الاعراف ۷: ۱۸۹ (۱۲۰)المحرر الوجیز، ۲۵۷/۱ (۱۲۱)روح المعانی، ۶۴/۲

(۱۲۲) حدیث: ((مَنِ اسْتَطَاعَ مِنكم الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجَ فَإِنَّهُ لِلْبَصَرِ واحْصَنَ لِلْفَرْجِ وَمَنْ يستطع منكم، فعليه بالصوم)) یعنی تم میں سے جو شخص نکاح کی طاقت رکھتا ہو وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح نگاہ کو نیچی رکھنے والا اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جو شخص نکاح کی قوت نہ رکھے تو پھر اس کے لیے روزہ ہے۔ (ابی داؤد، سلیمان بن الاشعث بن اسحاق السجستانی، دار السلام للنشر والتوبیخ، ریاض، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء، السنن، کتاب النکاح، باب التحریض علی النکاح، رقم الحدیث: ۲۰۴۶، ۲۹۶)

(۱۲۳)تدبر قرآن، ۴۱۲/۱، ۴۱۳ (۱۲۴)پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۰۰ھ، ۱۲۷/۱

(۱۲۵)البقرہ ۲: ۲۷

(۱۲۶)المفردات، ص۵۲۷ (۱۲۷)المعجم الوسیط، ص۹۴۷ (۱۲۸)مترادفات القرآن، ص۳۵۷

(۱۲۹)المفردات، ص۵۲۷ (۱۳۰) التوبہ۹: ۱۳ (۱۳۱)مترادفات القرآن، ص۳۵۷ (۱۳۲)النحل۱۶: ۹۱

(۱۳۳)البقرہ ۲: ۲۷ (۱۳۴) تفسیر البیضاوی، ۶۴/۱ (۱۳۵)الکشاف، ۱۴۸/۱؛ روح المعانی، ۲۱۰/۱؛ التفسیر المنیر، ۱۱۸/۱

****